بڑھیا نے مسرور اور مخمور آنکھوں سے دیکھ کر کہا:

''کوڑی کوڑی کا حساب لے لوں گی۔ اس پھیر میں نہ رہنا۔''

رما اپنے کمرے میں گیا تو اس کا دل بہت خوش تھا۔ آج اسے وہی مسرت ہو رہی تھی جو گھر کی یاد دلاتی تھی۔ گھر پر جو پیار ملتا تھا، وہ اس کا حق تھا۔ یہاں جو پیار ملا، گویا آسمان سے ٹپکا تھا۔

وہ نہا دھو کر پوجا کا سوانگ بھرنے بیٹھا تو بڑھیا آ کر بولی: ''بیٹا! تمہیں روٹی بنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایک مسرانی ٹھیک کر دی ہے۔ وہ تمہارا کھانا پکا دیا کرے گی۔ دھرم کرم سے رہتی ہے۔ بھیا ایسی بات نہیں ہے۔''

ان ضعیف آنکھوں میں گہری لازوال مادریت جھلک رہی تھی۔ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز خود مٹ گئی۔ بولا۔ ''جب تم میری ماں ہو گئیں تو پھر کیا فرق، میں تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں گا۔''

بڑھیا نے زبان دانتوں سے دبا کر کہا: ''ارے نہیں بیٹا! میں تمہارا دھرم نہ لوں گی۔ کہاں تم برہمن کہاں ہم کھٹک۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔''

''میں تمہاری رسوئی میں کھاؤں گا۔ جب ماں باپ کھٹک ہیں تو بیٹا بھی کھٹک ہی ہے۔''

''اور جو تمہارے گھر والے سنیں تو کیا کہیں۔''

''مجھے کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں ہے، آدمی گناہ سے نیچا ہوتا ہے، کھانے پینے سے نیچا نہیں ہوتا۔ پریم سے جو کھانا ملتا ہے، وہی پاک ہوتا ہے، اس سے تو دیوتا بھی انکار نہیں کر سکتے۔''

بڑھیا کے دل میں اپنے ذات کی امتیاز کا جذبہ بیدار ہوا، بولی: ''بیٹا کھٹک کی کوئی نیچی ذات نہیں ہے۔ ہم لوگ برہمن کے ہاتھ کا بھی بھوجن نہیں کھاتے، کہار کے ہاتھ کا پانی تک نہیں پیتے، ماس مچھلی ہاتھ سے نہیں چھوتے۔ کوئی کوئی سراب پیتے ہیں، لیکن چھپ کر۔ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا بیٹا۔ بڑے بڑے تلک دھاری گٹا گٹ پیتے ہیں، لیکن میری روٹیاں تمہیں اچھی لگیں گی؟''

رما نے مسکرا کر کہا: ''پریم کی روٹیوں میں امرت رہتا ہے۔ چاہے گیہوں کی ہوں یا باجرے کی۔''

بڑھیا یہاں سے چلی تو گویا آنچل میں مسرت کا خزانہ بھرے ہوئے ہو۔

(28)

جب سے رما چلا گیا تھا، رتن کو جالپا کے بارے میں بہت تشویش ہوگئی۔ وہ کسی بہانہ سے اس کی مدد کرتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی چاہتی تھی کہ جالپا کسی طرح تاڑ نہ جائے، اگر کچھ روپے خرچ کر کے بھی وہ رما کا پتا لگا سکتی تو خوشی سے خرچ کر دیتی۔

جالپا کی وہ روتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا دل مسوس اٹھتا تھا، وہ اسے ہشاش دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اندھیرے رونے گھر سے اوب کر وہ جالپا کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ وہاں گھڑی بھر ہنس بول لینے سے اس کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہی نحوست چھا گئی۔ یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دنیا میں

ہوں۔ اس دنیا میں جہاں زندگی ہے، تمنا ہے، محبت ہے اور مسرت ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو قرض کی قربان گاہ کی نذر ہو چکی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شہر کے معزز اور خوشحال گھروں سے رتن کے مراسم تھے، لیکن جہاں اعزاز تھا، وہاں تکلف تھا۔ نمائش تھی، حسد تھا، غیبت تھی، کلب کی صحبت سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہاں تفریح ضرور تھی لیکن مردوں کی عاشقانہ نگاہیں بھی تھیں۔ بے قرار دل بھی، رندانہ بذلہ سنجیاں بھی۔

جالپا کے گھر اگر وہ شان نہ تھی، وہ دولت نہ تھی تو وہ نمائش بھی نہ تھی۔ وہ تنگ دل بھی نہ تھی۔ رما جوان تھا، خوش رو تھا۔ ممکن ہے شوقین بھی ہو، مگر رتن کو ابھی تک اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقع نہ ملا تھا اور جالپا جیسی نازنین کی موجودگی میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔

زندگی کے بازار میں اور سبھی دکانداروں کی دغابازیوں سے تنگ آ کر اس نے چھوٹی سی دکان میں آ کر پناہ لی تھی، مگر یہ دکان ٹوٹ گئی۔ اب وہ کس بازار میں زندگی کی جنس خریدے گے۔ سچا مال پائے گی۔

ایک دن وہ گراموفون لائی اور شام تک بجاتی رہی۔ دوسرے دن تازہ میووں کی ایک ٹوکری لا کر رکھ گئی۔ جب وہ آتی تو کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اب تک وہ جاگیشری سے بہت کم ملتی تھی، مگر اب اکثر اس کے پاس آ بیٹھتی اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی۔ کبھی کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی اور اس کے بال گوندھتی۔ گوپی اور بشمبر سے بھی اب اسے محبت ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی دونوں کو موٹر پر سیر کرانے لے جاتی۔ سکول سے آتے ہی دونوں اس کے بنگلے پر پہنچ جاتے اور

دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے۔ ان کے شور و غل میں رتن کو دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

ایک دن رتن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ جالپا نے پوچھا:

''کیا آج طبیعت اچھی نہیں ہے؟''

رتن نے غمناک لہجہ میں کہا: ''طبیعت تو اچھی ہے مگر آج رات بھر جاگنا پڑا۔ رات سے وکیل صاحب کو بہت تکلیف ہے۔ جاڑوں میں انہیں دمہ کا دورہ ہو جاتا ہے، بے چارے جاڑوں بھر دوائیں کھاتے رہتے ہیں، مگر یہ مرض گلا نہیں چھوڑتا۔ کلکتہ میں ایک نامی بید ہیں، اب کے انہی سے علاج کرانے کا ارادہ ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ کہتے ہیں وہاں بڑی تکلیف ہوگی، لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کسی کو ساتھ تو رہنا ہی چاہیے۔ وہاں دو بار ہو آئی ہوں اور جب گئی ہوں بیمار ہو گئی ہوں۔ مجھے وہاں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، لیکن اپنے آرام کو دیکھوں یا ان کی بیماری کو دیکھوں۔ اگر کوئی میرا سب کچھ لے کر بھی انہیں اچھا کر دے تو میں خوشی سے دے دوں۔''

جالپا نے پوچھا: ''یہاں کسی بید کو نہیں بلایا؟''

''یہاں کے بیدوں کو دیکھ چکی۔ بید، ڈاکٹر اور حکیم کوئی تو نہیں بچا۔''

''تو پھر کب تک آؤ گی؟''

''کچھ ٹھیک نہیں۔ ان کی بیماری پر ہے۔ ایک ہفتہ میں آ جاؤں یا مہینہ دو مہینہ لگ جائیں، مگر جب تک بیماری کی جڑ نہ ٹوٹ جائے، نہ آؤں گی۔''

تقدیر غیب میں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ جالپا دل میں مسکرائی۔ جس بیماری کی جڑ جوانی میں نہ ٹوٹی، بڑھاپے میں کیا ٹوٹے گی۔

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا: ''تم بھی چلتیں تو بڑا مزہ آتا؟''

جالپا نے دردناک انداز سے کہا: ''کیسے چلوں بہن! جانے بھی پاؤں۔ یہاں دن بھر آس لگی رہتی ہے۔ کوئی خبر آتی ہوگی۔ وہاں میرا جی اور بھی گھبرائے گا۔''

''میرا دل تو کہتا ہے، بابو جی کلکتے ہی میں ہیں۔''

''تو ذرا ادھر ادھر تلاش کرنا۔ اگر کوئی خبر ملے تو مجھے اطلاع دینا؟''

''اس کے لیے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے جالپا۔''

''یہ مجھے معلوم ہے، خط برابر بھیجتی رہوں گی۔''

''ہاں ضرور۔ روز نہیں تو ایک روز ناغہ دے کر ضرور لکھوں گی۔''

جالپا پان بنانے لگی۔ رتن اس کے چہرے کی طرف منتظر آنکھوں سے تاکتی رہی۔ گویا کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر حجاب کے باعث کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جالپا نے پان دیتے وقت اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا:

''کیا ہے بہن، کیا کہہ رہی ہو؟''

''میرے پاس کچھ روپے ہیں تم رکھ لو۔ میرے پاس رہیں گے تو خرچ ہو جائیں گے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا: ''اور جو مجھ سے ہی خرچ ہو جائیں؟''

رتن خوش ہو کر بولی: ''تمہارے ہی تو ہیں۔''

جالپا خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تاکتی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ رتن

نے سمجھا اسے اعتراض ہے۔ شکوے کے انداز سے بولی:

''تم نے کچھ جواب نہ دیا بہن! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھ سے کھچی کیوں رہتی ہو۔ میں چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں مغائرت نہ رہے، لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو..... مان لو، میرے سو پچاس روپے تمہیں سے خرچ ہو گئے تو کیا ہوا؟ بہنوں میں تو ایسا کوڑی کوڑی کا حساب نہیں ہوتا۔''

جالپا نے متین لہجہ میں کہا'' کچھ کہوں، برا تو نہ مانوں گی؟''

''برا ماننے کی بات ہوگی تو ضرور برا مانوں گی۔''

''ممکن ہے تمہیں بری لگے، لیکن میں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کہتی۔ تم اپنے دل میں سوچو۔ تمہارے اس بہنا پے میں رحم یا امداد کا خیال شامل ہے یا تم میری غریبی پر ترس کھا کر.....''

رتن نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور بولی: ''بس اب رہنے دو۔ تم چاہے جو سمجھو، مگر یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ تھا، نہ ہوسکتا ہے۔ مجھے تو اگر بھوک لگتی ہو تو بے تکلف کہہ بیٹھوں۔''

جالپا نے اسی بیگانہ پن سے کہا: ''تم ایسا کہہ سکتی ہو، تم جانتی ہو کہ کسی دوسرے موقع پر تم روٹیوں کے عوض میوے کھلا سکتی ہو، لیکن ایشور نہ کرے کوئی ایسا موقع آئے۔ جب تمہارے گھر میں روٹی کا ٹکڑا نہ ہو تو شاید تم اتنی بے تکلف نہ ہوسکو۔''

رتن نے بے ساختہ پن سے کہا: ''مجھے اس حالت میں بھی تم سے مانگنے میں حجاب نہ ہوگا۔ دوستی حالات کی پروا نہیں کرتی۔ ایسی باتیں کر کے تم میرا دروازہ بند کر رہی ہو۔ میں نے سمجھا تھا، تمہارے ساتھ زندگی کے دن کاٹ دوں گی، لیکن تم

ابھی سے دامن چھڑائے لیتی ہو۔ بدنصیبوں کو پریم کی بھیک بھی نہیں ملتی۔''

یہ کہتے کہتے رتن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جالپا اپنے کو غم نصیب سمجھتی تھی اور غم نصیبوں کو تلخ حق کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رتن کی مصیبت اس کی مصیبت سے کہیں زیادہ دل شکن ہے۔ جالپا کو شوہر کے لوٹ آنے کی اب تک امید تھی۔ اس کے آتے ہی اس کے ایام غم بھول جائیں گے۔ اس کی امیدوں کا آفتاب پھر روشن ہوگا۔ اس کی آرزوؤں اور ترنگیوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ روشن، دلفریب اور وسیع۔ رتن کا مستقبل کیا تھا۔ کچھ نہیں، گہری تاریکی۔

رتن آنکھیں پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''خطوں کا جواب دیتی رہنا۔''

جالپا نے کہا: ''روپے دیتی جاؤ۔''

رتن نے تھیلی سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

لیکن اس کے چہرے پر خوشی نہ تھی۔ جالپا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''کیا برا مان گئیں؟''

رتن نے روٹھ کر کہا: ''برا مان کر تمہارا کیا کرلوں گی؟''

جالپا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ فرط الفت سے اس کا دل لہلہا اٹھا۔ رتن سے اسے اتنی محبت کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک اس سے کھنچتی تھی۔ جلتی تھی۔ آج اسے رتن کی اصلی صورت نظر آئی۔ اس نے سوچا یہ سچ مچ بدنصیب ہے اور مجھ سے زیادہ۔ ایک لمحہ میں رتن آنکھوں میں آنسو اور ہنسی ایک ساتھ بھرے ہوئے رخصت ہوگئی۔

کلکتہ میں وکیل صاحب کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔کوئی تکلیف نہ ہوئی۔رتن نے مہراج اور ٹیمل کو ساتھ لے لیا تھا۔دونوں وکیل صاحب کے پرانے ملازم تھے اور گھر کے آدمی ہو گئے تھے۔شہر کے باہر ایک بنگلہ میں تین کمرے لے لیے گئے تھے۔احاطہ میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔بڑی فرحت کی جگہ تھی۔قرب وجوار میں اور کتنے ہی بنگلے تھے۔شہر کے لوگ ادھر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے اور ہرے ہو کر لوٹتے تھے،مگر رتن کو جگہ پھاڑے کھاتی تھی۔بیمار کے تیماردار بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔افسردہ دلوں کے لیے جنت بھی ویران ہے۔

سفر نے وکیل صاحب کو اور بھی مضمحل کر دیا۔دو تین دن تو ان کی حالت پہلے سے ابتر ہو گئی،لیکن معالجہ شروع ہونے کے بعد وہ کچھ سنبھلنے لگے۔رتن صبح سے آدھی رات تک ان کی چارپائی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔وکیل صاحب چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے تو دل کھول کر کراہیں،اسے تشفی دینے کے لیے وہ اپنی حالت چھپانے کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

وہ پوچھتی آج کیسی طبیعت ہے،تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔"آج تو جی بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔"بیچارے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹتے تھے،مگر رتن پوچھتی رات نیند آئی تھی،تو کہتے ہاں خوب سویا۔رتن جب کھانا لے کر جاتی تو رغبت نہ ہونے پر بھی کھا لیتے۔رتن سمجھتی تھی،اب یہ اچھے ہو رہے ہیں۔بیمراج

سے بھی وہ یہی کیفیت بیان کرتی تھی۔ کبیر راج بھی اپنے معالجہ کی کامیابی پر خوش تھے۔

ایک دن وکیل صاحب نے رتن سے کہا: ''مجھے خوف ہے کہ اچھا ہونے کے بعد کہیں مجھے تمہاری دوا نہ کرنی پڑے؟''

رتن نے خوش ہو کر کہا: ''اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ تمہاری بیماری مجھے دے دیں۔''

''شام کو گھوم آیا کرو۔ اگر بیمار پڑنے کی خواہش ہو تو میرے اچھے ہونے پر پڑنا۔''

''کہاں جاؤں۔ میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہیں سب سے اچھا لگتا ہے۔''

وکیل صاحب کو یکا یک رمانا تھ کا خیال آ گیا۔ بولے: ''ذرا شہر کے پارکوں میں گھوم گھام کر دیکھو۔ شاید رمانا تھ کا پتا چل جائے؟''

رتن کو اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ اسے ملاقات ہو جانے کی امید نے ایک لمحہ کے لیے بے تاب کر دیا۔ کہیں وہ پارک میں بیٹھے مل جائیں تو پوچھوں۔ کہیے بابو جی! اب بھاگ کر کہاں جائیے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی جالپا سے میں نے وعدہ تو کیا تھا، لیکن یہاں آ کر بھول گئی۔

رتن نے تشویش کے ساتھ کہا: ''لیکن فکر تو نہیں لگی رہے گی۔''

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا: ''میں تو اچھا ہو رہا ہوں۔''

رتن بے دلی کے ساتھ بولی: ''اچھا چلی جاؤں گی۔''

مگر رتن کو کل سے وکیل صاحب کی تشفی انگیز باتوں پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ ان کی صورت سے اچھے ہونے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہ اچھے ہو رہے ہیں تو ان کا چہرہ روز بروز کیوں زرد ہوتا جاتا ہے۔ آنکھیں کیوں ہر وقت بند رہتیں ہیں۔ جسم کیوں گھلتا جاتا ہے۔ مہراج اور خدمت گار سے وہ اپنا شبہ نہ ظاہر کر سکتی تھی۔ کبیراج سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔

اگر کہیں رما مل جائے تو ان سے پوچھتی۔ ممکن ہے کسی ڈاکٹر سے ان کی ملاقات ہو۔ ان کبیراج سے وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

جب رتن چلی گئی تو وکیل صاحب نے ٹیمل سے کہا: ''مجھے ذرا اٹھا کر بٹھا دو۔ ٹیمل! پڑے پڑے کمر سیدھی ہو گئی۔ ایک پیالی چائے پلا دو۔ کئی دن ہو گئے چائے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ دودھ کی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے، مگر ان کی خاطر سے پی لیتا ہوں۔ مجھے تو ان کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ تمہیں کیا خیال ہے؟''

ٹیمل نے وکیل صاحب کو تکیہ کے سہارے بٹھا کر کہا۔ ''بابو جی! یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا۔ بہو جی کے ڈر کے مارے نہیں کہتا تھا۔''

وکیل صاحب ایک منٹ تک خاموش رہ کر بولے: ''میں موت سے نہیں ڈرتا ٹیمل! بالکل نہیں، مجھے دوزخ اور بہشت پر بالکل یقین نہیں ہے۔ اگر آدمی کو اپنے اعمال کے مطابق جنم لینا پڑتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا جنم کسی اچھے گھر میں ہوگا۔ تاہم مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں مر گیا تو کیا ہوگا؟''

ٹیمل بولا: ''بابو جی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ بھگوان چاہیں گے تو آپ

اچھے ہو جائیں گے۔ کہیے تو کل کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ آپ لوگ تو انگریجی پڑھے ہیں۔ کچھ مانتے ہی نہیں۔ مجھے تو کوئی دوسرا ہی پھیر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گنواروں کی بھی سن لیا کیجیے۔ آپ مانو یا نہ مانو، میں تو کل ایک سیانے کو لاؤں گا۔''

وکیل صاحب نے منہ پھیر لیا۔ جن و آسیب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کئی سیانوں کو پیٹ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شعبدہ بازی ہے بالکل ریاکاری، لیکن اس وقت انہیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ ٹیمل کی اس تجویز سے اختلاف کرتے۔

مہراج نے چائے لاکر کہا۔ ''سرکار چائے پی لیجیے۔''

وکیل صاحب نے چائے کے پیالے کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''لے جاؤ اب نہ پیوں گا۔ بہو جی کو معلوم ہو گیا تو ناراض ہوں گی۔'' ایک منٹ کے بعد پھر وہ بولے ''کیوں مہراج! جب سے میں آیا ہوں۔ میرا چہرہ کچھ ہرا ہوا ہے؟''

مہراج نے ٹیمل کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ رخ دیکھ کر رائے دیا کرتے تھے۔ خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی۔ اگر ٹیمل نے کہا ہے، آپ اچھے ہو رہے ہیں تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ ٹیمل نے اس کے خلاف کہا ہے تو انہیں بھی خلاف کہنا چاہیے۔ ٹیمل نے ان کی پریشانی کو بھانپ کر کہا: ''ہرا کیوں نہیں ہوا ہے۔ ہاں مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں ہوا ہے۔''

مہراج بولے: ''ہاں کچھ ہرا جرور ہوا ہے مگر بہت کم۔''

وکیل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد انہیں ضعف

ہو جاتا تھا اور دس پانچ منٹ خاموش پڑے رہتے تھے۔ شاید انہیں اپنی حالت کا واقعی علم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عقل و دماغ پر موت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ اگر کچھ امید تھی تو اتنی کہ شاید دل کی کمزوری سے انہیں اپنی حالت سے مایوسی ہو رہی ہو۔ ان کا دم پہلے سے زیادہ پھولنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نکل جائے گی۔ نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ کون جانے یہی حبس ذرا اور بڑھ کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔

سامنے باغ میں چاندنی کہرے کی چادر اوڑھے زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہو کر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے اور آنسوؤں کی بوندیں گرا کر پھر المناک آنکھوں سے تاکنے لگتے تھے۔

دفعتاً وکیل صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے دونوں گوشوں میں آنسوؤں کی دو بوندیں مچل رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولے:

''ٹیمل! کیا سدھو آئے تھے۔'' پھر اس سوال پر آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولے:

''مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سدھو آئے ہوں۔'' پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

''سدھو'' اس کے بیٹے کا نام تھا جو جوان موت مر چکا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب کو بار بار اسی کی یاد آ رہی تھی۔ کبھی اس کا بچپن سامنے آ جاتا۔ کبھی اس کی موت آنکھوں میں پھر جاتی۔ ان کا حافظہ کبھی اتنا روشن، کبھی اتنا صحیح نہ تھا۔

کئی منٹ کے بعد انہوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ میری ماں آ کر پوچھ رہی ہے۔ بیٹا تمہاری طبیعت کیسی ہے۔

دفعتاً انہوں نے کیمل سے کہا: ''یہاں آ جاؤ، جا کر کسی وکیل کو بلا لاؤ۔ جلد آنا، ورنہ بہو جی آتی ہوں گی۔''

اتنے میں موٹر کا ہارن سنائی دیا اور ایک لمحہ میں رتن آ پہنچی۔ وکیل کو بلانے کی بات ٹل گئی۔

وکیل صاحب نے چہرے کو بشاش بنا کر پوچھا:

''کہاں کہاں ہو آئیں۔ کچھ رمانا تھ کا پتا چلا؟''

رتن نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''کئی جگہ گئی، وہ کہیں نہیں دکھائی دیئے۔ اتنے بڑے شہر میں سڑکوں کا پتا تو جلدی چلتا نہیں۔ وہ بھلا کہیں ملیں گے، دوا کھانے کا وقت تو آ گیا ہوگا؟''

وکیل صاحب نے دبی زبان سے کہا: ''لاؤ کھالوں۔''

رتن نے دوا نکالی اور انہیں اٹھا کر پلائی۔ اس وقت وہ نہ معلوم کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر غالب تھی۔

یکا یک اس نے کہا: ''ان لوگوں میں سے کسی کو تار دے دوں؟''

وکیل صاحب نے پرسوال نظروں سے دیکھا، پھر آپ ہی آپ اس کا مطلب سمجھ کر بولے: ''نہیں نہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر ایک لمحہ کے بعد اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کر کے بولے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اپنی

وصیت لکھا دوں۔'' جیسے ایک ٹھنڈی تیز نکیلی چیز رتن کے تلوؤں سے گھس کر سر سے نکل گئی۔ گویا اس کے جسم کی ساری بندشیں کھل گئیں۔ سارے اعضا بکھر گئے۔ جیسے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اوپر سے آسمان اڑ گیا اور اب وہ بے حس، بے جان معلق کھڑی ہے۔

رندھے ہوئے گلے سے بولی: ''گھر سے کسی کو بلاؤں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔''

اپنوں کے لیے رتن اس وقت بے قرار ہو اٹھی۔ کوئی بھی تو اپنا ہوتا جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔ گھر کے لوگ آ جاتے تو دوڑ دھوپ کر کے کسی دوسرے ڈاکٹر کو لاتے۔ وہ اکیلی کیا کرے۔ آخر بھائی بند اور کس دن کام آئیں گے۔ مصیبت میں ہی تو اپنے کام آتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔

وصیت کی بات اسے پھر یاد آ گئی۔ یہ خیال کیوں ان کے دل میں پیدا ہوا؟ وید جی نے تو کچھ نہیں کہا۔ کیا ہونے والا ہے؟ ایشور! یہ خیال اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ اس کی طبیعت آواز بلند سے رونے کے لیے مائل ہو گئی۔ اپنی ماں یاد آئی۔ اپنی ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔

مہراج نے آ کر کہا۔ ''سرکار کھانا تیار ہے۔ تھالی پروسوں۔''

رتن نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا، وہ بغیر انتظار کیے چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں مہراج پر رتن کو رحم آ گیا۔ اس نے کیا خطا کی۔ جو کھانے کے لیے پوچھنے آیا۔ کھانا بھی ایسی چیز ہے جسے کوئی چھوڑ سکے۔ وہ رسوئی میں جا کر بولی۔ ''تم لوگ کھا لو۔ مہراج مجھے آج بھوک نہیں ہے۔''

مہراج نے اصرار کیا۔ ''وہی لقمے کھالو سرکار۔''

رتن ٹھٹک گئی۔ مہراج کے اصرار میں اتنا خلوص، اتنی ہمدردی بھری ہوئی تھی کہ رتن کو ایک طرح کی تشفی کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔ یہ کتنا غلط خیال تھا۔ مہراج نے اب تک رتن کو ایک تندمزاج مالکن کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہی مالکن آج اس کے سامنے کھڑی گویا ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رتن نے پوچھا۔ ''کیوں مہراج تمہارا کیا خیال ہے۔ بابو جی کو اس بیراج کی دوا سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔''

مہراج نے ڈرتے ڈرتے وہی الفاظ دہرائے جو آج وکیل صاحب سے کہے تھے ''کچھ کچھ تو ہو رہا ہے مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں۔''

رتن نے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی مجھے دھوکا دیتے ہو مہراج!''

مہراج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔ ''بھگوان سب اچھا ہی کریں گے، بہو جی گھبرانے سے کیا ہوگا۔ اپنا تو کوئی اختیار نہیں۔''

رتن نے پوچھا۔ ''یہاں کوئی جیوتشی تو نہ ملے گا۔''

مہراج نے سرگرمی کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا بہو جی! لیکن بابو جی کا مزاج تو جانتی ہو۔ ان باتوں سے کتنا بگڑتے ہیں۔''

رتن نے تاکید کر کے کہا۔ ''سویرے کسی کو ضرور بلا لانا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور جالپا کو یہ خط لکھنے لگی۔

''بہن.....! نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہونے والا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے

کہ میں کتنے بڑے مغالطہ میں پڑی ہوئی تھی۔ وکیل صاحب اب تک مجھ سے اپنی حالت چھپاتے تھے، مگر آج یہ بات ان کے قابو سے باہر ہوگئی۔ تم سے کیا کہوں۔ آج وہ وصیت لکھوانے جا رہے تھے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے، جی چاہتا ہے کہ تھوڑی سی سنکھیا کھا کر سو رہوں۔ ایشور کو دنیا رحیم اور کریم اور جانے کیا کیا کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل کوئی دشمن بھی نہیں ہوسکتا۔ پچھلی زندگی کا قصہ محض دل سمجھانے کے لیے ہے۔ جس سزا کا سبب ہی ہمیں معلوم نہ ہو اس سزا کی وقعت ہی کیا۔ وہ تو زبردست کی لاٹھی ہے، جو اپنے لیے کوئی حیلہ گھڑ لیتی ہے۔ اس اندھیری ہولناک، پرخار شاہراہ زندگی میں صرف ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی مجھ سے چھنا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں میں کہاں جاؤں گی۔ کون میرا رونا سنے گا۔ کون میری باہنہ پکڑے گا۔

بہن! مجھے معاف کرنا۔ مجھے بابو جی کی تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی، آج شہر کی سڑکوں کا چکر لگا آئی ہوں۔ کچھ موقع ملا تو پھر جاؤں گی۔''

یہ خط لکھ کر رتن برآمدے میں آئی۔ دیکھا، وکیل صاحب کی سانس زوروں پر چل رہی تھی۔

(30)

رات کے تین بج چکے تھے۔ رتن آدھی رات کے بعد آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے جھپکیاں لے رہی تھی کہ یکایک وکیل صاحب کے گلے کی گڑگڑاہٹ سن کر

چونک پڑی۔ الٹی سانس چل رہی تھی۔ وہ ان کے سرہانے چارپائی پر بیٹھی تھی اور ان کا سر اٹھا کر اپنی جانگھ پر رکھ لیا۔ ابھی نہ جانے کتنی رات باقی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا ابھی تین بجے تھے۔ سویرا ہونے میں چار گھنٹے کی دیر تھی۔ کبیراج کہیں نو بجے آئیں گے، گھر میں چاروں طرف سوتا پڑا تھا۔ رتن کے دل پر خوف طاری ہوگیا۔ یہ منحوس رات کبھی ختم بھی ہوگی یا نہیں؟

کئی منٹ کے بعد وکیل صاحب کی سانس رکی۔ سارا جسم پسینے میں تر تھا۔ ہاتھ سے رتن کو ہٹ جانے کے لیے کہا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ میں انہوں نے نحیف آواز میں کہا: ''رتن اب جدائی کا وقت آ گیا۔ میری خطائیں..'' انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور رتن کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھا، کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ رتن نے چیخ کر پکارا، کیا ٹیمل مہراج دونوں مر گئے۔

مہراج نے آ کر کہا۔ ''میں سویا تھوڑے بہوجی، بابو جی کی حالت.....''

رتن نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بکومت۔ جا کر کبیراج کو بلا لاؤ، کہنا ابھی چلیے۔''

مہراج نے فوراً اپنا پرانا اوورکوٹ ڈالا، سوٹا اٹھایا اور چل دیئے۔ رتن اٹھ کر آگ جلانے لگی کہ شاید سینک سے کچھ فائدہ ہو۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر اس میں یاس کی ہمت پیدا ہوئی۔ ساری گھبراہٹ، سارا ضعف دور ہوگیا۔ اس کی جگہ اعتماد کی قوت پیدا ہوئی۔ فرض کے احساس نے اس کے سارے ادراک کو بیدار کر دیا۔ اسٹوو جلا کر اس نے روئی کے گالوں سے وکیل صاحب کی چھاتی کو سینکنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک متواتر سینکنے کے بعد وکیل صاحب کی سانس کچھ

رکی۔ رتن کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ کر بولے:

''تمہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے رتن! کیا جانتا تھا کہ یہ وقت اتنی جلد آ جائے گا۔ میں نے تمہارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کتنا وحشیانہ ظلم۔ میں نے تمہاری زندگی غارت کر دی۔ میری خطاؤں کو معاف کرنا۔''

یہی آخری الفاظ تھے جو ان کے منہ سے نکلے۔ یہی زندگی کا آخری رشتہ تھا۔

یہی بزم حیات کا آخری دور۔

رتن نے مایوس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک مہراج کا پتا نہ تھا۔ ہاں ٹیمل کھڑا تھا۔

رتن نے کہا: ''ٹیمل ذرا پانی گرم کرو گے؟''

ٹیمل نے وہیں کھڑے کھڑے کہا: ''پانی گرم کیا کرو گی بہو جی۔ گئو دان کرا دو۔ دو بوند گنگا جل منہ میں ڈال دو۔''

رتن نے مرنے والے کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ گویا ٹیمل کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وکیل صاحب کا سینہ گرم تھا۔ اس نے پھر منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہراج نہ نظر آئے، وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ کبیراج آ جاتے تو شاید ان کی حالت سنبھل جاتی۔ پچھتا رہی تھی کہ ان کو یہاں کیوں لائی۔ شاید راستے کی تھکان اور آب و ہوا کی تبدیلی نے مرض کو لاعلاج کر دیا۔ یہ پچھتاوا ابھی ہو رہا تھا کہ میں شام کو سیر کرنے چلی گئی۔ شاید اتنی ہی دیر میں انہیں سردی لگ گئی ہو۔

لیکن پچھتاوے کی یہی باتیں نہ تھیں۔ اس آٹھ سال کی زندگی میں میں نے

انہیں کیا آرام پہنچایا۔ وہ بارہ بجے تک قانونی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ میں پڑی سویا کرتی تھی۔ وہ مؤکلوں سے معاملۂ مقدمہ کی باتیں کرتے تھے، میں باغیچہ اور بازاروں کی سیر کرتی تھی۔ میں نے انہیں کسب دولت کا محض ایک آلہ سمجھ لیا۔ وہ کتنا چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں اور باتیں کروں، لیکن میں بھاگتی پھرتی تھی۔ میں نے کبھی ان کے دل کے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنے گھر میں چراغ نہ جلا کر دوسروں کے اجالے گھر کا لطف اٹھاتی رہی۔ تفریح کے سوا مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اپنے جلے ہوئے دل کو یوں تسکین دے کر میں خوش تھی۔ کھیر اور ملائی کی تھالی مجھے کیوں نہ ملی۔ اس غم میں میں نے اپنی روٹیوں کو لات ماردی۔

آج رتن کو اس محبت کا کامل ثبوت ملا۔ جو مرنے والے کے دل میں تڑپتی رہتی تھی۔ رتن کے لیے تو زندگی میں پھر بھی کچھ دلچسپی تھی، ان کے لیے زندگی میں کون سا آرام تھا۔ زندگی کیا ایک مستقل ریاضت تھی، جس کا خاص مقصد تکمیل فرض تھا۔ کیا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان فکروں سے انہیں آزاد نہ کرسکتی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دلجوئی اور مزاج شناسی سے یہ بجھنے والا چراغ کچھ دن اور روشن رہتا، لیکن اس نے شوہر کے ساتھ اپنے فرض کا کبھی خیال ہی نہ کیا۔ اس کا دل ہمیشہ بغاوت پر کمر بستہ رہا۔ محض اس لیے کہ ان سے میرا تعلق کیوں ہوا۔ رتن کا ضمیر اس وقت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس سے پامال ہو رہا تھا۔ اس نے شوہر کے بے جان قدموں پر اپنا سر جھکایا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سارے باغیانہ جذبات، جو اس کے دل میں اٹھتے رہتے تھے، وہ سارے ناہمدردانہ خیالات، جنہیں وہ بار بار

دبانے کی کوشش کرتی رہتی تھی، اس وقت سینکڑوں بچھوؤں کی طرح ڈنک مار رہے تھے۔ ہائے میرا یہ برتاؤ، اس آدمی کے ساتھ تھا، جس نے اپنے تئیں مجھ پر قربان کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کر کے اس کا دل پھٹا جاتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے یہی آرزو ہوتی تھی کہ اسی وقت میری جان نکل جائے، ان قدموں کو اپنی پیشانی سے سہلاتے ہوئے۔ آج اس کے دل میں کتنا ایثار دوڑا آتا تھا کہ گویا مدتوں کی اندوختہ دولت کو وہ آج ہی اسی وقت لٹا دے گی۔ موت کی نورانی ضیا کے سامنے اس کے باطن کی ساری کدورتیں مٹ گئیں۔

وکیل صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن چہرے پر کسی جذبہ کے آثار نہ تھے۔ رتن کی بےخودی بھی ان کے بجھتے ہوئے ادراک کو روشن نہ کر سکتی تھی۔ شادی اور غم کی بندشوں سے وہ آزاد ہو گئے تھے اور کوئی روئے تو غم نہیں۔ ہنسے تو خوشی نہیں۔ ٹیمل نے اچمنی میں گنگا جل لے کر ان کے منہ میں ڈال دیا۔ آج انہوں نے کچھ مزاحمت نہ کی وہ جو رسوم اور معتقدات کا دشمن تھا، اس وقت خاموش ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں مذہبی اعتقاد رونما ہو گیا تھا، بلکہ اس میں اب کوئی حس نہ تھی، اتنے ہی توکل سے وہ زہر کا گھونٹ بھی پی جاتا۔

انسانی حیات کا اہم ترین واقعہ کتنی خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ کائنات کا ایک رکن اعظم، وہ تمناؤں کا طوفانی سمندر، وہ سعی و عمل کا لافانی مخرج، وہ محبت اور حسد، خوشی اور رنج کا جوالا ان گاہ، وہ عقل و شعور کی رنگ بھوم، نہ جانے کب اور کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک ہچکی بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں، ایک آہ بھی نہیں نکلتی۔ سمندر کی